www.KitaboSunnat.com

عبدالقوی لقمان

اسلام اور فتنۂ اعتزال

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَالَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا، فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ، عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ ﴾

"حالانکہ ان کو اس (حقیقت) کی کچھ خبر نہیں۔ وہ صرف "ظن" پر چلتے ہیں اور "ظن" یقین کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔ تو جو ہماری یاد سے روگردانی کرے اور صرف دنیا ہی کی زندگی کا خواہاں ہو، اس سے (اے نبی ﷺ!) تم بھی منہ پھیر لو۔ ان کے علم کی یہی انتہا ہے۔ تمہارا پروردگار اس کو بھی خوب جانتا ہے جو اُس کے رستے سے بھٹک گیا۔ اور اُس سے بھی خوب واقف ہے جو (سیدھے) رستے پر چلا"

(سورۃ النجم: ۲۸۔۳۰)

خلفائے بنو امیہ کے آخری دور میں جب عجمی فلسفہ کو عرب میں مقبولیت حاصل ہوئی تو مسلمانوں میں بھی کلامی بحثیں شروع ہوگئیں اور یونانی فلسفہ کے زیراثر کچھ لوگوں نے مذہبی عقائد پر فلسفیانہ انداز میں غور و فکر شروع کردیا، وہ صرف ان باتوں کو ماننے کے لئے تیار تھے جن کو اُن کی عقل تسلیم کرتی تھی۔

ایسے ہی لوگوں میں سے ایک شخص "واصل بن عطاء" تھا جو حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا شاگرد تھا اور حضرت خواجہؒ صاحب سے دورانِ حصول تعلیم کسی مسئلہ پر ان سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے حلقہ درس سے الگ ہوگیا۔ اس نے مسجد کے ایک کونے میں اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ بیٹھنا شروع کردیا۔ اس پر حضرت امامؒ نے فرمایا: "قد اعتزل عنا" کہ یقیناً وہ ہم سے الگ ہوگیا۔ یہی شخص "واصل بن عطاء" فتنۂ اعتزال کا بانیِ اول تھا اور اس کے پیرو کاروں کو معتزلہ (یعنی اہل السنۃ الجماعۃ سے الگ ہونے والے) کہا جاتا ہے۔

معتزلہ کے عقائد

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ عقل کی برتری معتزلہ صحیح و غلط کا فیصلہ کرنے کے لئے صرف عقلی استدلال پر انحصار کے قائل تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مذہب کی ہر چیز کو عقل پر پرکھنا چاہئے (نہ کہ نقل پر) اور جو بات بظاہر عقل کی زد میں نہ آرہی ہو تو اُس کی عقل کے ذریعے قابل فہم توضیح کی جائے۔ چنانچہ وہ جسمانی معراج کے سرے سے منکر تھے۔ ان کے خیال میں آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات صرف تصور میں کی تھی۔

۲۔ خدا کے متعلق نظریہ ـــــ معتزلہ کا عقیدہ تھا کہ خدا کا کوئی جسمانی وجود نہیں ہے۔ اس لئے اس کو مادی آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ نیز وہ خدا کی ذات کو اس کی صفات سے کوئی الگ چیز نہیں مانتے تھے (تسہیل تاریخ اسلام از پروفیسر ایچ۔ آر۔ شیخ، صفحہ ۴۰۱)

۳۔ معتزلہ کے اصولِ خمسہ ـــــ "فتنۂ اعتزال" کے اصل محرک عمرو بن عبید، واصل بن عطاء، غزّال اور ان کے متبعین ہیں جس کا ظہور حضرت حسن بصریؒ کی موت کے فوراً بعد دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہی ہوگیا تھا۔ قتادہؒ وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ لوگ الگ مجلس میں بیٹھا کرتے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ واصل بن عطاء نے چند اصول وضع کئے تو ان کی تائید عمرو بن عبید (شاگرد حضرت حسن بصریؒ) نے کی۔ ہارون الرشید کے عہد میں ابوالہُذیل نے دو کتابیں لکھیں اور ان کے مذہب کو خوب اُچھالا۔ اُن کے مذہب کا مدار پانچ معروف اصولوں پر رکھا۔ وہ پانچ اصول یہ ہیں:

(۱) عدل، (۲) توحید، (۳) وعید کا نفاذ، (۴) منزلۃ بین المنزلتین (یعنی دو مرتبوں کے درمیان کا مرتبہ) اور (۵) امر بالمعروف و النہی عن المنکر (یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) ـــــ اِن پانچ اصولوں کی وضاحت بالاختصار پیش خدمت ہے:

حقیقت میں "معتزلہ" نے ان اصولوں کے پس پردہ حق اور باطل کو خلط ملط کرکے رکھ دیا ہے اور اس کا اصل سبب، ان کا اللہ تعالیٰ کے افعال کو بندوں کے افعال پر قیاس کرنا ہے۔ وہ بندہ کے ہر اچھے یا قبیح عمل کو منجانب اللہ گردانتے ہیں۔ اور اسی غلط قیاس کی بنا پر ہی وہ حقیقی خالق کائنات کے بارے میں ایسے الفاظ ادا کرتے ہیں جو اس رحیم و کریم اور علیم و قدیر ذات کی جلالت و کبریائی اور شان کے منافی ہیں مثلاً یہ کہ یجب علیہ یفعل کذا (کہ اس پر ایسا کرنا واجب ہے) ولا یجوز لہ ان یفعل کذا (کہ اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے) واضح ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو ان کا یوں مخلوق پر قیاس ہر لحاظ سے باطل اور فاسد ہے۔

مثال کے طور پر اولادِ آدمؑ میں سے اگر کوئی آقا اپنے نوکر کو اپنی لونڈی کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے دیکھ لے اور اس کے باوجود وہ اس کو منع نہ کرے، تو دو صورتوں میں سے ایک

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورت ضرور ہوگی یا تو وہ آقا اپنے نوکر کی اس قبیح حرکت کو اچھا خیال کرتا ہے یا وہ ان کو اس بری حرکت سے روکنے سے عاجز ہے۔ تیسری اور کوئی صورت وہاں نہیں ہو سکتی۔ جبکہ اللہ تعالیٰ آقائے کُل ہونے کے باوجود ان تمام افعال کو برداشت کرتا ہے اور اس پر غیرت کھاتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں اس کو کوئی بھی صورت لائق نہیں۔ قرآن مجید میں حق تعالیٰ جل شانہ نے واضح اور دو ٹوک انداز سے اپنے اور اپنی مخلوق کے مابین فرق کو بیان فرمادیا ہے کہ:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (سورۃ الشوریٰ:۱۱)

"اس اللہ جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا (اور) سنتا ہے۔"

اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہوا:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (سورۃ الروم:۲۷)

"اور وہی (ذات) تو ہے جو خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اُسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اُسے بہت آسان ہے اور آسمانوں و زمین میں اُس کی شان بہت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے"

ان آیاتِ قرآنیہ کو پڑھ اور سُن لینے کے بعد یہ بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ معتزلہ کی بنیاد کس قدر فاسد اور باطل ہے اور خالق اور مخلوق کے افعال میں کیا نسبت ہے؟ —— ذیل میں ان کے اصولِ خمسہ کی تشریح پیش کی جاتی ہے:

اصلِ اول —— عدل

سے معتزلہ کا مقصود صرف اور صرف "نفی قدر" (یعنی اللہ کی تقدیر کا انکار کرنا) ہے اور وہ اسی عقیدہ کے بل بوتے پر ببانگِ دھل یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ نہ "شر" کو پیدا کرتا ہے اور نہ ہی اسے پیدا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ بقول ان کے اگر ہم یہ بات تسلیم کرلیں کہ وہ "شر" کا خود خالق ہے اور پھر اس "شر" میں واقع ہونے والے اپنے بندوں کو عذاب بھی دے تو یہ عدل کے سراسر منافی کام ہے بلکہ یہ ظلم سمجھا جائے گا اور "اللہ تعالیٰ" تو سب سے بڑھ کر "عادل" ہیں۔ لہٰذا وہ شر کا خالق نہیں کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ سے ظلم کا صدور محال ہے۔

لیکن ان کے اس فاسد اصول پر بہت بڑا فساد جنم لیتا ہے اور وہ یہ کہ حقیقی پروردگار اور مختار کُل ذات اپنی بادشاہی اور الوہیت میں یکتا اور کائنات کی ہر چیز پر قادر مطلق ہونے کے باوجود ایسے کام بھی کر گزرتا ہے جو وہ چاہتا نہیں ہوتا، اور بسا اوقات بعض کام کرنا چاہتا ہے اور وہ کر نہیں سکتا، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات صفت "عجز" (لاچاری و بے بسی) سے متصف

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہے جو کہ ہر اعتبار سے باطل، لغو اور صریح آیات قرآنیہ کے خلاف ہے۔ (شرح العقیدہ الطحاویۃ: ۵۸۹)

غرضیکہ "معتزلہ" قدر کے مسئلہ میں خاصے گمراہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے انسان کو اپنے افعال و اعمال میں اپنے تئیں مختار کل بنا دیا اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ باور کیا گویا کہ ایک تماشائی کی حیثیت سے یہ سب کچھ خیر و شر دیکھ رہا ہے۔ ایسے عقائد کا باطل ہونا بالکل واضح ہے۔

جہاں تک انسان کے اپنے ذاتی عمل میں خود مختار ہونے کی بات ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جزا و سزا کا معاملہ اس وقت تک ہوتا ہے جب تک انسان کسی عمل کو بجا لانے میں دسترس اور طاقت رکھتا ہے اور جہاں سے کسی عمل میں اضطرار کی کیفیت شروع ہو جاتی ہے تو وہیں سے انسان "مرفوع القلم" کے حکم میں آجاتا ہے، نیز جزا و سزا کا قانون تو قادر مطلق نے رکھا ہی ایک مکلّف شخص پر ہے نہ کہ "مضطر" پر اور مکلّف شخص کے بارے میں بھی فرمانِ ایزدی ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۸۲)

"خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى، وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى، ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴾ (سورۃ النجم: ۳۹-۴۱)

"یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اس کا پورا پورا بدل دیا جائے"

اسی آیتِ کریمہ سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ حقیقی عدل کرنے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور دوسرا یہ کہ حقیقی عدل کا قیام اور اس کا اظہار، ایمان بالآخرت کو متضمن ہے، کیونکہ اگر حقیقی جزا و سزا یا مکافاتِ عمل "عدل" کی صورت میں اس دنیا میں ملنے شروع ہو جائیں تو دنیا میں نوع انسانی تو درکنار ہر جاندار چیز کا ہی بالکل خاتمہ ہو جائے۔ فرمانِ باری ہے:

﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ (سورۃ فاطر: ۴۵)

"اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگے، تو روئے زمین پر ایک (بھی) چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑے لیکن وہ ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے"

جبریہ کا نظریہ

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ "معتزلہ" کا قدر یعنی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے بارے میں عقیدہ جبریہ فرقہ کے بالکل برعکس ہے اگر "معتزلہ" نے نفیِ قدر میں غلو کیا ہے تو "جبریہ" (جس کا اصل زعیم و امام جہم بن صفوان سمرقندی ہے) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے اثبات میں غُلُو کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "مخلوق کے جملہ اعمال و افعال کی تدبیر خود الٰہ کائنات کرتا ہے اور اس سلسلے میں انسان کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا، بالکل ایسے ہی جیسے درختوں کا لہرانا، پتوں کا حرکت کرنا اور نبضوں کا چلنا وغیرہ" اور کہتے ہیں کہ اعمال کی نسبت انسان کی طرف مجازی ہے اور اس دعویٰ میں سب سے بڑی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے لیتے ہیں:

﴿ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ﴾ (سورۃ الانفال:۱۷)

"اور (اے نبی ﷺ) جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ خدا نے پھینکی تھیں"

آیتِ ہذا سے "جبریہ" کا استدلال بالکل صحیح نہیں ـــــ چونکہ کسی کام کے صدور کے کئی اسباب ہوتے ہیں لہٰذا مجازاً کسی ایک کی طرف بھی نسبت کرنا صحیح ہوگا جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے۔ لیکن حقیقی نسبت مان لینے سے بہت بڑا فساد جنم لیتا ہے۔ مثلاً اگر کنکری پھینکنے کی بجائے کسی اور کام کا ذکر کیا جائے اور کہا جائے:

وما صليت اذ صليت ولكن الله صلى، وما زنيت اذ زنيت..... وما سرقت اذ سرقت.....

"کہ جب تو نے نماز پڑھی تو تم نے نہیں پڑھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھی، اس طرح جب تو نے برائی کا ارتکاب کیا یا چوری کی تو حقیقت میں تم نے نہیں کی بلکہ..... (العیاذ باللہ)

تو اس عقیدے کا فساد و بطلان ظاہر اور واضح ہے۔ (شرح عقیدہ طحاویہ: ص ۴۹۵)

تقدیر کے بارے میں صحیح نظریہ

اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے بارے میں صحیح عقیدہ جبریہ اور قدریہ کے مابین ہے کہ افعال و اعمال اللہ تعالیٰ کی تخلیق لیکن اس کے بندوں کا کسب (یعنی کمائی) ہیں۔ حتیٰ کہ شیطان ابلیس لعین جو کہ منبعِ شر ہے اس کو بھی اور اس کے جملہ اعمال کو افعال کو بھی خود خالقِ حقیقی نے بھی پیدا کیا ہے اور اس حقیقت پر اس کا اپنا بیان شاہد ہے:

﴿ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴾ (سورۃ الاعراف:۱۲)

"کہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم) کو مٹی سے پیدا کیا ہے"

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا یہ بات سُن اور سمجھ لینے کے بعد ـــــ کہ ہر چیز کا خالق خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس نے ہر چیز کو ایک اندازے پر رکھا ہے: ﴿ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ﴾ (سورۃ الفرقان:۲)

نیز ارشاد ہے: ﴿ إِنَّ اللهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۰) کہ "وہ ذاتِ الٰہی ہر چیز پر قادر مطلق ہے" اور "ہر چیز اس کے پاس ایک مقرر مقدار کے مطابق ہے": ﴿ وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ ﴾ (سورۃ الرعد:۸) اور جس بات کا فیصلہ فرمالیتا ہے اس کے لئے کُن (کا لفظ) کہتا ہے تو وہ ہو جاتا ہے: ﴿ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴾ (سورۃ مریم:۳۵)

وہ ذاتِ باری تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ وہ خیر و شر کو پیدا کرسکے۔ قرآن مجید میں واضح طور پر یہ بات ذکر کردی گئی ہے: ﴿ اللهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ (سورۃ الرعد:۱۸) کہ "(کائنات کی) ہر چیز کو پیدا کرنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے" اور وہ اللہ جس کام کا ارادہ کرتا ہے اس کو کر گزرتا ہے: ﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴾ (سورۃ البروج:۱۶) ـــــ لہٰذا اس ذات باری تعالیٰ کے لئے اپنے بندوں کے جملہ افعال و اعمال اور خیر و شر کو پیدا کرنے میں کائنات کی کوئی چیز حاجز و مانع (یعنی رکاوٹ) نہیں بن سکتی۔ قرآن مجید میں ﴿ وَاللهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴾ (سورۃ الصافات:۹۶) "تم کو اور جو تم عمل کرتے ہو (سب کو) خدا ہی نے پیدا کیا ہے" سے واضح ہوا کہ ہر چیز (بشمول خیر و شر) کا خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن افعال انسانی، انسان کا کسب ہیں، اِس کی کمائی ہیں جس کو کرنے، نہ کرنے میں وہ خود مختار ہے۔

اصلِ دوم ـــــ توحید

لفظ "توحید" سے معتزلہ اپنے اس مخصوص عقیدے کی وضاحت کرتے تھے، جو ارسطو نے پیش کیا تھا اور بڑے ہی طمطراق سے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ توحیدِ خالص کے قائل ہیں اور باری تعالیٰ کو ہر قسم کے شرک سے پاک اور مبرّا دیکھنا چاہتے ہیں۔ باری تعالیٰ یکتا ہے، قدیم ہے، اس معاملے میں کوئی دوسری صفت یا چیز اس کی شریک نہیں، لہٰذا اگر اس کی صفات بھی اس کی ذات کی طرح ازلی و ابدی مان لی جائیں تو اس سے "تعدّدِ قدماء" لازم آتا ہے جو حقیقت میں "شرک" ہے۔ چنانچہ یہ لوگ خدا کی صفات مثلاً علم، قدرت، حیات، سمع، بصر وغیرہ کو اس معنی میں مانتے تھے کہ "وہ (اللہ تعالیٰ) فی ذاتہ قادر، حیّ، سمیع و بصیر ہے۔ اس کی کوئی "صفت" اس کی ذات پر الگ یا زائد نہیں" (آئینہ پرویزیت: جلد۱، ص۳۱)

اس طرح انہوں نے لفظ "توحید" کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کردیا، اور اہل

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

السنۃ والجماعۃ کو غلط سمجھتے ہوئے ان کا نام انہوں نے مشبّہۃ رکھ چھوڑا (اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کا اثبات کرتے ہیں جو مخلوق میں بھی پائی جاتی ہیں لہٰذا بقول معتزلہ کے اس نظریہ سے خالق و مخلوق میں تشبیہ لازم آتی ہے) جبکہ معتزلہ نے اللہ تعالیٰ کے "اسماء" کا اقرار کیا۔ لہٰذا ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات (علم، قدرت، سمع و بصر) محض "اعلام" ہیں جو کہ ایک ہی ذات کے متعدد اسماء ہیں، نہ کہ ایک ذات کی مختلف صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک ہی شخص کے تین نام زید، عمر، اور محمد رکھ دیئے جائیں۔ بعض معتزلہ کے نزدیک اس نظریے کی تفصیل یوں ہے کہ وہ ذات "علیم" تو ہے لیکن بغیر "علم" کے، "قدیر" تو ہے لیکن بغیر "قدرت" کے "سمیع و بصیر" تو ہے لیکن بغیر "سننے اور دیکھنے" کی صفت رکھنے کے۔ (التحفۃ المھدیہ شرح "الرسالۃ التدمریہ" از شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ جلد، ص ۴۵-۴۶)

ایک شبہ کا ازالہ

معتزلہ نے "اہل السنۃ والجماعۃ" کا نام مشبّہۃ رکھا کہ یہ لوگ صفات میں خالق کو مخلوق کے ساتھ ملا دیتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے اثبات سے مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے اور یہ صریح شرک ہے، اور ہم اصل اہلِ توحید ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو سرے سے مانتے ہی نہیں۔

معتزلہ کا یہ اعتراض عقل و نقل دونوں کے اعتبار سے فاسد اور غیر صحیح ہے کیونکہ اگر ذاتِ باری تعالیٰ کو "علیم و قدیر" "سمیع و بصیر" ماننے سے مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے تو اگر یوں کہا جائے کہ وہ "ذات نہ سمیع ہے، نہ بصیر نہ علیم ہے، نہ قدیر، نہ محب ہے اور نہ متکلم" تو اس سے معدوم شے سے تشبیہ لازم آئے گی، تو ایسی تشبیہ، خالق حقیقی کے حق میں (یعنی کسی چیز کے اثبات کے بجائے نفی) بدترین تشبیہ ہے۔

نقل کے اعتبار سے یوں کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر قرآن مجید میں اپنی صفات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جبکہ اپنی مخلوق کو بھی انہیں صفات کے ساتھ متصف ٹھہرایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود خالق اور مخلوق کے درمیان تشبیہ لازم نہیں آتی۔ ذیل میں چند آیاتِ مبارکہ ملاحظہ ہوں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی صفت "حیات" کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۵۵) جبکہ اپنی بعض مخلوقات کو بھی صفت "حیات" سے موصوف ٹھہرایا ہے: ﴿ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ ﴾ (سورۃ الروم:۱۹) لیکن خالق کی صفت "حیات" اور مخلوق کی صفت "حیات" میں ایسا ہی فرق ہے جیسا

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ خود خالق اور مخلوق میں۔

اس طرح ایک اور مقام پر یوں فرمایا: ﴿ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴾ (سورۃ الذاریت: ۲۸) یہاں غلام سے مراد اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں، ایک دوسری جگہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بابت فرمایا: فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴾ (سورۃ الصافات:۱۰۱) ان آیات میں مخلوق کے لئے "حلیم و علیم" کی صفتیں بیان ہوئی ہیں اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات "حِلم و علم" کا ذکر ہوا ہے لیکن مخلوق کے "حلم و علم" اور خالق کائنات کے "حِلم و علم" میں فرق واضح ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و بصر اور رأفہ و رحمہ کا ذکر ہوا ہے: ﴿ إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا..... إِنَّ اللهَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴾ (سورۃ النساء: ۵۸) اور ﴿ إِنَّ اللهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ (سورۃ البقرہ: ۱۴۳) جبکہ یہی صفات قرآن مجید میں مخلوق کے لئے بھی وارد ہوئی ہیں اور وہ یہ ہیں: ﴿ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴾ (سورۃ الدھر: ۲) اور ﴿ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ..... حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ (سورۃ التوبہ: ۱۲۸) تو ان آیات کو پڑھ اور سمجھ لینے کے بعد یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے سمع و بصر، رافۃ و رحمۃ اور مخلوق کی سمع و بصر اور رافۃ و رحمۃ میں قریب کی بھی موافقت نہیں۔

بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو مشیت (یعنی مرضی) کے ساتھ متصف کیا ہے، اور فرمایا: ﴿ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللهُ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴾ (سورۃ الدھر: ۳۰) اور اس سے پہلے مخلوق کی مشیت کا بھی یوں ذکر ہوا ہے: ﴿ إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴾ لیکن دونوں کا مشیت میں خالق و مخلوق ہونے کا بعد ہے۔

بعینہ قرآن مجید میں ایک دوسری صفت ارادہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ جس میں خالق و مخلوق دونوں کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ﴾ (سورۃ الانفال: ۶۷) لیکن ہر صاحبِ عقل و دانش اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ خالق و مخلوق کے "ارادوں" میں کتنا فرق ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی "محبت و رضا" اور اس کے بندوں کی "محبت و رضا" کا ایک ساتھ ذکر یوں ہوا ہے: ﴿ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ ﴾ (سورۃ آل عمران: ۳۱) ﴿ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ﴾ (سورۃ المائدۃ: ۵۴) اور رضا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ رَّضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ﴾ (سورۃ البینہ: ۸) تو یہاں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ خالقِ حقیقی کی "محبت و رضا" اس کی

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذات کے شان و شایان ہے۔ جبکہ مخلوق کی "محبت و رضا" جیسی کہ مخلوق کو لائق ہے۔ دونوں میں قریب کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی طرح بے شمار صفات جن کا قرآن مجید میں خالق و مخلوق کے ساتھ ذکر ہوا ہے، اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ ان صفات کے اثبات سے خالقِ حقیقی کی مخلوق کے ساتھ قطعاً تشبیہ لازم نہیں آتی اور نہ ہی یہ شرک کی قبیل سے ہے بلکہ یہ عین حق اور اصل توحید ہے بلکہ خالق کائنات کو لفظ "توحید" کے پس پردہ اس کی صفات سے معطل کرکے کسی معدوم چیز سے تشبیہ دینا ہی اصل "شرک" ہے۔ (التحفة الهدية شرح الرسالة التدمرية، جلدا ص۵۵-۵۹)

اس مسئلہ کی کامل وضاحت کے لئے قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ ہی کافی ہے:

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ (سورۂ طٰہٰ:۱۱۰)

آیتِ کریمہ کے پہلے حصہ ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ کہ "اس جیسی کوئی چیز نہیں" میں مشبہۃ مشرکین کا رد ہے جبکہ دوسرے حصہ ﴿ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴾ اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے، میں اسماء و صفات کا منکرین کا رد ہے اور اسی آیت کریمہ کے مطابق ہی تمام ائمہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے، جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

"لا يوصف الله تعالى الا بما وصف به نفسه او وصف به رسوله لا يتجاوز القرآن والحديث و مذهب السلف رحمهم الله تعالى انهم يصفون الله تعالى بما وصف به نفسه وبما وصف به رسوله من غير تحريف ولا تعطيل ومن غير تكييف ولا تمثيل" (الفتوىٰ الحمويۃ الکبریٰ از شیخ الاسلام احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیۃ، ص۱۶)

"کہ اللہ تعالیٰ کی ذات انہی صفاتِ (جلیلہ) سے متصف ہے جن صفات کے ساتھ اس نے اپنی ذات کو موصوف کیا ہے اور جن صفات کے ساتھ اس کے رسول ﷺ نے بھی موصوف ٹھہرایا ہے جو کہ قرآن و حدیث کی اصل سے متجاوز نہیں۔ اور یہی مسلک تمام سلف صالحینؒ کا بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ان صفات سے متصف ٹھہراتے ہیں جن کے ساتھ اس نے خود اپنی ذات کو اور اس کے رسول ﷺ نے اس کی ذات کو متصف فرمایا ہے بغیر کسی تحریف و تعطیل اور کیفیت و تمثیل کے"

علاوہ ازیں بے شمار دیگر ائمہ دین کے اقوال اس عقیدہ کی صحت پر شاہد ہیں:

حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ کہ "رحمٰن (کی ذات) عرش پر مستوی ہے" ——

محکمہ دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بارے میں سوال کیا گیا کہ آیتِ کریمہ میں "استویٰ" سے کیا مراد ہے، تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"الاستواء غیر مجهول، والکیف غیر معقول ومن الله الرسالة وعلی الرسول البلاغ المبین وعلینا التصدیق"

کہ "استواء" نامعلوم ہے اور اس کی کیفیت غیر معقول (مجہول) ہے اور یہ پیغام منجانب اللہ ہے اور رسول اللہ ﷺ پر اس پیغام کو من و عن پہنچا دینا ہے اور ہم سب پر اس پیغام کی تصدیق کرنا لازم ہے۔

نیز اسی طرح کے الفاظ امام مالک بن انسؒ سے بھی مروی ہیں کہ "استواء" کے بارے میں سوال پر آپؒ نے فرمایا:

"الاستواء معلوم والکیف مجهول والایمان به واجب والسؤال عنه بدعة"

کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا بالکل واضح اور غیر مبہم ہے لیکن اس کی کیفیت (مخلوق کے حق میں) غیر معلوم ہے جبکہ اس بات پر ایمان لانا واجب اور اس سلسلے میں استفسار بدعت ہے (الفتوی الحمویة الکبری: ص ۲۳)

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں صحابہ کرامؓ نے کبھی آنحضرت ﷺ سے سوال نہیں کیا بلکہ جن صفات کے ساتھ اللہ جل شانہ نے اپنی ذات کو موصوف ٹھہرایا اور اس کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں خبر دی۔ بغیر تحریف و تعطیل اور تکییف اور تمثیل کے ان جملہ صفات کا اثبات فرمایا اور کسی قسم کی فاسد تاویل کی بجائے من و عن ان پر ایمان لائے۔ امام مالک بن انسؒ اور ان کے استاذ محترم ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کے اس مذکورہ جوابات کو اللہ تعالیٰ کی بقیہ تمام صفات پر (ان کے اثبات و اقرار کے لئے) قیاس کر لینا "اسماء و صفات" کے مسئلہ کو سمجھ لینے کے لئے کافی ہوگا۔ اِن شاء اللہ! ——— (جاری ہے)

محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع ومنفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ